سوال نمبر 2 (الف) (i)

تعلیم کا دوسرا دور

مسلمانوں کی تعلیم کے دوسرے دور میں، جو ۱۴۵۳ء سے عثمانیہ حکومت تک قائم رہا، مذہب اسلام دُور دُور تک پھیل گیا۔ پہلے جو دین صرف عرب کے صحراؤں میں قید تھا۔ اب نکل کر دور دراز علاقوں تک پھیل گیا۔ دریائے سندھ کے کنارے تک مسلمان حکومت کر رہے تھے۔ دنیا کی بہت سی قومیں اپنے دلی شوق سے اور اسلام سے متاثر ہو کر اسلام قبول کر لیتی ہیں۔ مرو، ہرات، نیشاپور، بخارا، فارس، بغداد، شام، اندلس سب دینِ اسلام سے منور ہو گئے ہیں۔ مگر یہ حکومت صرف اُوپری تھی۔

سوال نمبر 2 (الف) (ii)

حکومت کا کردار

مذکورہ دور میں تعلیم کی سرپرستی میں حکومت کا کوئی کردار نظر نہیں آتا تھا۔ اس لیے کہ اُس دور میں عربیوں نے تمام علاقوں کو فتح کیا۔ اور دور دراز علاقوں میں جاکر اپنی حکومتیں قائم کیں۔ مگر یہ حکومت ایسی بے تعلق اور اوپری تھی کہ لوگوں کے عام رسم و رواج، اخلاق، تہذیب و تمدن اور زندگی گزارنے کے طور طریقوں پر فاتح قوم کی تہذیب کا اثر نہ تھا۔ تمام علوم پر عربی کی مہر لگ گئی۔ مگر حکومت کی طرف سے نہ کوئی مدرسہ قائم ہوا نہ یونیورسٹی۔ وہ تعلیم کی طرف کوئی توجہ دیتے نہیں تھے۔

سوال نمبر 2 (الف) (iii)

علوم و فنون کی زبان

مسلمانوں کی تعلیم کے دوسرے دور میں تمام علوم و فنون پر عربی کی مہر لگ چکی تھی۔ کیونکہ حکومت عربی نسلوں کی تھی اس لیے علوم عربی میں حاصل کیے جاتے۔ اس دور میں حکومت کی طرف سے مدرسے نہ تھے بلکہ علم تعلیم کے لیے ہزاروں مکتب قائم ہوئے۔ اوسط اور اعلیٰ تعلیم کے لیے مسجدوں کے صحن، خانقاہوں کے حجرے، علما کے ذاتی مکانات کا استعمال کیا جاتا۔ مگر یہ عمارات انتہائی فیاضی کے ساتھ علم دیتی۔ مرو، ہرات، نیشاپور، بخارا، فارس، بغداد، مصر، شام، اندلس کا چھوٹے سے چھوٹا علاقہ بھی علمی سوتوں سے گونج رہا تھا۔

حصہ (دوئم)

حکومت کی عدم دلچسپی

سوال نمبر 2 (الف) (iv)

دوسرے تعلیمی دور میں حکومت کی تعلیم میں دلچسپی نہ ہونے کے برابر تھی - مگر اس کے باوجود بھی تعلیمی تناسب میں اضافہ ہوا - اس کی وجہ سے تھی کہ لوگوں نے اپنی مدد آپ کے تحت عام تعلیم کے لیے ہزاروں مکتب قائم کیے جو آج کے تحصیلی مدارس سے زیادہ مفید تھے - علماء اور خانقاہ بڑی وسعت سے تعلیم دیتے اور لوگ جوش و جذبے سے تعلیم حاصل کرتے - اوسط اور اعلیٰ تعلیم کے لیے مسجدوں کے صحن، خانقاہوں کے حجرے اور علما کے ذاتی مکانات استعمال ہوتے تھے لیکن ان سادہ اور بے تکلف عمارات میں انتہائی وسعت کے ساتھ علم کی تربیت ہوتی تھی -

سوال نمبر 2 (الف) (v)

عنوان : دوسرا دورِ تعلیم

تلخیص:

تعلیم کے دوسرے دور میں اسلام دور دراز علاقوں تک پھیل چکا ہے۔ مگر عربی حکومتیں تعلیم میں دلچسپی نہ رکھتی ہیں۔ کیونکہ اِن کی تہذیب کا کوئی اثر علوم قوموں پر نہ ہے۔ علوم و فنون عربی میں رائج ہیں اور اِس وسعت سے بڑھ رہے ہیں کہ بغداد، فارس، مصر غرض ہر علاقے میں علم کی صدائیں گونج رہی ہیں۔ حکومت کی طرف سے کوئی مدارس نہ تھے مگر عام تعلیم کے لیے مکتب قائم ہیں اور اعلیٰ تعلیم کے لیے مسجدوں کے صحن خانقاہوں کے حجرے، علماء کے ذاتی مکانات ہیں جو اتنی فیاضی سے تعلیم دیتے ہیں۔ جو بعد میں بڑے عالی شان عظم نہ دے سکے۔

سوال نمبر 2 (الف) (vi)

سوال نمبر 2 (ب) (i)

نوجوانوں کو ترغیب

اختر شیرانی اِس نظمیہ جزو میں نوجوانوں کو مخاطب کرکے کہتے ہیں کہ وطن کی سلامتی کی خاطر تلوار بلند کرو۔ ایسی تلوار کہ جس سے کوئی نہ بچ پائے۔ اور مسلمانوں کو وطن کی حفاظت اور سربلندی کی خاطر جان کا نذرانہ پیش کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ شاعر نوجوانوں کو وطن کی حفاظت کے لیے جان قربان کرنے کا درس دیتے ہیں۔ شاعر آگے بڑھنے اور دشمنوں کی صفوں کو کچلنے کا پیغام دیتے ہیں کہ یہ ہی وطن کی صدا ہے۔

؎ اے وطن! تُو نے پکارا تو لہو کھول اُٹھا — تیرے بیٹے تیرے جانباز چلے آتے ہیں

سوال نمبر 2 (ب) (ii)

مرکزی خیال

شاعر اِس نظمیہ جزو میں وطن کے نوجوانوں کو مخاطب کرکے کہتے ہیں کہ وطن کے نام کی خاطر تلوار بلند کرو اور اِس ملک کی حفاظت اور سربلندی کے لیے اپنی جانوں کے نذرانے پیش کرنے سے گریز نہ کرنا۔ یہ وطن تمھیں صدائیں دیتا ہے۔ اور اِس وطن کی حفاظت اور ترقی کے لیے بڑھے چلو اور مسلسل محنت کرو کہ تم ہی ہو جس کی تلوار سے دشمن لرز جاتے ہیں اور جو دشمنوں کی صفوں کو توڑنے کی صلاحیت رکھتے ہو۔

سوال نمبر 2 (ب) (iii)

تیسرے شعر کا مفہوم

تیسرے شعر میں شاعر وطن کے نوجوانوں کو مخاطب کرکے کہتے ہیں کہ تم تلوار کے محبوب ہو اور تمھاری تلوار ہی سے یہ وطن محفوظ ہے۔ اِس ملک کے نوجوان ہی اتنی طاقت رکھتے ہیں کہ وہ دشمنوں کی صفوں کو اُکھاڑ دیتے ہیں۔ شاعر اِن بہادر جوانوں کو آگے بڑھنے کی ترغیب دیتے ہیں اور مسلسل کام کرنے کا درس دیتے ہیں کہ اِس سے ہی ہمارا ملک ترقی کر سکتا ہے اور وطن کے جوان ہی اِس قوم کا سرمایہ ہیں۔

؎ افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر — ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

عشق میں جیت اور ہار

سوال نمبر 2 (ج) (i)

فیض احمد فیضؔ اپنے لوگوں کو عشق میں تن، من، دھن قربان کرنے کی ترغیب دیتے ہیں کہ یہ عشق کی بازی میں ہار اور جیت کو ایک مقام حاصل ہے۔ فیضؔ کہتے ہیں کہ عشق میں ہار اور جیت کو ایک سا مقام حاصل ہوتا ہے۔ دراصل عشق ایک خدائی صفت ہے۔ اِس میں انسان اپنے آپ کو بھلا دیتا ہے۔ ایک عاشق صادق کے لیے اُس کی ذات معنی نہیں رکھتی وُہ صرف محبوب کی رضا کا پابند ہوتا ہے۔ ایسی کیفیت میں اگر محبوب حقیقی ہو یا مجازی عاشق کو ہار جیت سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا۔ کیونکہ ہر حال میں وُہ اپنے محبوب سے محبت کرتا ہے پھر چاہے وُہ اسے پالے یا نہ پائے۔ عاشق اِتنی اذیتوں کے بعد ہار اور جیت کو ایک سا مقام دیتے ہیں۔

؎ اِس شرط پہ کھیلوں گی پیا پیار کی بازی — جیتوں تو پیا تُجھے، ہاروں تو پیا تیری

سوال نمبر 2 (ج) (ii)

شاعر کی پارسائی

دوسرے شعر میں شاعر اپنی پارسائی کو غلط قرار دے رہے ہیں۔ شاعر کہتے ہیں کہ یہ جو لوگ مجھے متقی اور پرہیزگار سمجھتے ہیں یہ غلط ہیں کیونکہ میں بھی گناہ گار ہو چکا ہوں۔ شاعر کو بھی محبوب کے حسن نے مبہوت کر ڈالا ہے اور وہ بھی مرضِ عشق میں مبتلا ہو چکا ہے۔ شاعر کے مطابق اب میں وہ دین دار نہ رہا جو عشق و عاشق کو غلط سمجھتا تھا۔ بلکہ جب سے میں نے محبوب کی صورت دیکھی ہے، تب ہی سے میں اپنے تمام اخلاق و کردار بھلا چکا ہوں اور محبوب کے عشق میں مبتلا ہو کر دنیا اور دین بھول بیٹھا ہوں۔ اس لیے جو لوگ مجھے اب بھی پرہیزگار اور پارسا سمجھتے ہیں وہ غلط ہیں۔

؎ پھرتے ہیں خوار میرؔ یہاں کوئی پوچھتا ہی نہیں
اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

سوال نمبر 2(د) (i)

امدادی افعال

الف۔ اُس نے مجھے میری کتاب واپس کردی۔

امدادی فعل: دی (مصدر ہے دینا سے بنا ہے۔)

ب۔ اذان کا وقت ہوا چاہتا ہے۔

امدادی فعل: چاہتا (مصدر "چاہنا")

ج۔ وہ دو گھنٹے بعد یہاں سے چلا گیا۔

امدادی فعل: چلا (مصدر "چلنا")

سوال نمبر 2 (د) (ii)

مطلع

مطلع عربی زبان کا لفظ ہے جس کے لغوی معنی ہیں طلوع ہونے کی جگہ۔ غزل کا پہلا شعر جو ہم قافیہ اور ہم ردیف ہو مطلع کہلاتا ہے۔ مطلع کے دونوں مصرعے ہم قافیہ اور ہم ردیف ہوتے ہیں۔

ایک غزل میں ایک سے زیادہ مطلع بھی ہو سکتے ہیں۔ ایسے میں پہلا مطلع مطلع اول، دوسرا مطلع ثانی اور تیسرا مطلع ثالث ہے۔ مطلع کے بعد آنے والا شعر حسن مطلع کہلاتا ہے۔

مثالیں:- ؎ کوئی اُمید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

یہ مطلع کی مثال ہے جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ (بر، نظر) اور ہم ردیف (نہیں آتی) ہیں۔

؎ آئے پتھر تو مرے صحن میں دو چار گرے
جتنے اس پیڑ کے پھل تھے پسِ دیوار گرے

مجھے گرنا ہے تو میں، اپنے ہی قدموں میں گروں
جس طرح سایۂ دیوار پہ دیوار گرے

مطلع کے بعد آنے والا یہ شعر حسن مطلع ہے۔

سوال نمبر 3 (صفحہ نمبر 1) **(ب)**

سبق کا عنوان: ایک وصیت کی تعمیل

مصنف کا نام: مرحت اللہ بیگ

تشریح:

مرزا فرحت اللہ بیگ اپنے اس سبق میں مولوی وحید الدین سلیم کے بارے میں لکھتے ہیں کہ مرزا کو ہمیشہ سے ہی مولوی صاحب سے ملنے کا اشتیاق تھا مگر کبھی موقع نہ مل سکا۔ ایک روز اورنگ آباد جانے والی ریل میں مرزا کی مولوی صاحب سے ملاقات ہوگئی اور پھر وہاں سے اُن کی دوستی کا آغاز ہوا۔ مولوی وحید الدین سلیم اُردو ادب کے بلند پایہ ادیب اور محقق تھے۔ اِن کی عظمت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ اُن کی وفات کے بعد مرزا نے لکھا کہ اُن جیسا اُردو کے لیے کوئی نہ ہوگا۔ وُہ اردو کی اصطلاحات میں کمال رکھتے تھے اور معانی اور صرف و نحو میں خاص ملکہ حاصل تھی۔ بقول شاعر

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

مرزا فرحت اللہ بیگ مولوی صاحب کی خصوصیات بیان کرتے ہیں کہ مولوی صاحب جب بھی کوئی نااہل انسان عہدے دار دیکھتے تھے تو بہت دکھی ہو جاتے تھے۔ ایسے ہی ایک روز جب مولوی صاحب غمگین تھے تو مرزا نے اُنھیں تسلی دی کہ دنیا میں ہر انسان کو صلہ نہیں مل جاتا۔ دُنیا میں ہر انسان سب کچھ نہیں پا لیتا۔ یہ آخرت نہیں ہے کہ انسان کو اعمال کا حساب دینا پڑے اور جو بوؤ گے اُسی کا پھل ملے۔ دُنیا فریب کے سوا اور کچھ ہے ہی نہیں۔ بقول مفکر:

"دنیا دھوکے کا گھر ہے، مکڑی کا جالہ ہے"

مرزا مزید کہتے ہیں کہ اس دنیا میں عظیم لوگ ہمیشہ آشفتہ حال رہے ہیں۔ جو انسان لوگوں کو راحت فراہم کرتا ہے، اس کی اپنی زندگی اکثر آرام و سکون سے محروم ہوتی ہے۔ بڑے بڑے شاعروں اور

ادیبوں کی زندگی کا مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تنگ دستی میں زندگی گزار دی۔ یہی حال مولوی صاحب کا بھی تھا۔ بقول شاعر:

؎ اپنی تو مثال ہے جیسے کوئی درخت
اوروں کو سایہ دے خود دھوپ میں رہ کر

مرزا فرحت اللہ بیگ مولوی صاحب کو قناعت کا درس دیتے ہیں کہ انسان کو ہر حال میں صبر و شکر سے گزارا کرنا چاہیئے۔ انسان کی عظمت اسی میں ہے کہ وہ اللہ کے دیے ہوئے پر صبر کرلے اور اس بات پر راضی ہو جائے جو اللہ نے اُس کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ عظیم انسان وہی ہے جو اس بات کو مان لے کہ وہ بہت سوں سے بہتر ہے۔ یہی ایک خوبی انسان کو ممتاز بناتی ہے۔

؎ شہیدانِ وفا کے حوصلے تھے داد کے قابل وہاں پہ شکر کرتے تھے جہاں صبر مشکل تھا

انسان کی زندگی صرف چار دن کی ہے۔ اس میں اُسے ہر طرح کے حالات و واقعات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ لیکن انسان کو چاہیے کہ وہ رنج اور غموں سے بہادر بن کر سامنا کرے اور آگے بڑھتا جائے کیونکہ یہ زندگی مختصر سی ہے۔ اس میں کسی بات کو دل سے لگا لینے سے انسان کا نقصان ہوتا ہے اور انسان ہی غمزدہ ہوتا ہے۔

؎ کیا بھروسا ہے زندگانی کا آدمی بلبلہ ہے پانی کا

مگر مرزا کی باتوں میں مولوی صاحب کو کوئی اطمینان حاصل نہ ہوتا تھا۔ مولوی صاحب نے اپنی تمام زندگی غموں کو دیکھتے ہوئے گزاری تھی۔ اس لیے غربت اور افلاس نے اُن کی زبان کو کڑوا کر دیا تھا اور وہ جب تک لوگوں کو سُنا نہ لیتے سکون سے نہ بیٹھتے تھے۔ یہ وجہ ہے کہ وہ منافق نہ تھے جو دل میں ہوتا وہی زبان پر رکھتے۔ اس لیے ان کی لوگوں سے نہ بنتی تھی۔ الغرض اس اقتباس میں فرحت اللہ سے مولوی وحیدالدین سلیم کی خاکہ نگاری کی ہے۔

؎ ممکن نہیں ہے یہ طرزِ منافقت دنیا تیرے مزاج کا بندہ نہیں ہوں میں

سوال نمبر 4 (صفحہ نمبر 1) **(الف)**

نظم کا عنوان: مناظرِ سحر

شاعر کا نام: جوش ملیح آبادی

تشریح:

جوش ملیح آبادی نے اردو ادب میں بہت سی نظمیں لکھیں۔ اُن کی نظموں کی خاص بات اُن کی منظر نگاری اور اصطلاحات اور تشبیہات کا بے دریغ استعمال ہے جس سے انسان سوز میں کھو جاتا ہے۔ اس نظم میں شاعر صبح کے وقت کا حسین منظر بیان کرتے ہیں کہ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب رات جاتی ہے اور سورج طلوع ہوتا ہے۔ اِس وقت کی دل کشی اور رعنائی بیان سے باہر ہے۔

ے صبح کا وقت ہے کتنا دل نشیں
ہر طرح ہے نور سا پھیلا ہوا

شاعر کہتے ہیں کہ یہ صبح کا وقت ہے جب انسان اللہ کے قریب ہو جاتا ہے۔ اِس وقت میں انسان کی فریادیں سنی جاتی ہیں۔ دیکھا جاتا ہے کہ ہر مذہب اور مسلک کے لوگ صبح کے وقت عبادتیں کرتے ہیں۔ عیسائی چرچ جاتے ہیں، ہندو پنڈت ارتی کرتے ہیں اور مسلمان نماز پڑھتے ہیں کہ اس وقت کی بے خودی سے ہی انسان اللہ کو پہچان سکتا ہے۔ بقول شاعر

ے ہم ایسے اہلِ نظر کو ثبوتِ حق کے لیے
گر رسولؐ نہ ہوتے تو صبح کافی تھی

اس وقت کی بے خودی اور رعنائی میں انسان کا دل سرشار ہوتا ہے کہ جس طرح ایک اندھیری رات کے بعد بھی روشنی کی کرن اُجاگر ہوتی ہے اسی طرح انسان کو بھی مایوسی اور نا اُمیدی سے دور رہنا چاہیے کہ اس وقت میں انسان یہ محسوس کر لیتا ہے کہ ہر اندھیری رات کے بعد ایک روشن صبح منتظر ہے۔

اِس عظیم وقت میں ہر وقت اللہ کی رحمت چھا ہوتی ہوتی ہے۔ اِس وقت میں اِنسان اگر اللہ کی عبادت کرے اور اپنے آپ کو بھلا کر اس کا ذکر کرے تو اِنسان دلی سکون اور اللہ کی رحمت پا لیتا ہے۔ دیکھا جاتا ہے کہ صبح کے وقت ہر جاندار اور بے جان اللہ کی حمد و ثنا بیان کرتا ہے۔ بقول شاعر

ؔ عبادتوں کے در کھولے
سعادتوں کے در کھولے
درِ قبول وا ہوا
دعا کا وقت ہوا چاہتا ہے

یہ ایک ایسا وقت ہے کہ جس میں کسی صورت بھی آرام جائز نہیں۔ تحقیق سے ثابت ہوتا ہے کہ نہ صرف دین کی سلامتی کے لیے بلکہ انسانی صحت کے لیے بھی صبح کو اُٹھنا بہت مفید ہے۔ وُہ انسان جو صبح سویرے بیدار ہوتا ہے وُہ ہر وقت چاق و چوبند رہتا ہے۔ اِس لیے اِس وقت آرام ممنوع ہے۔

ؔ رات کو سونا سویرے سویرے، صبح کو اُٹھنا شتاب
دولت و صحت بڑھائے، عقل کو دے آب و تاب

یہ وُہ وقت ہے جب اِنسان کی کی گئی دعائیں قبول ہوتی ہیں۔ اِنسان صبح کے وقت اللہ کے حضور کھڑا ہو کر جو دعائیں مانگتا ہے اُن کو قبولیت بخشی جاتی ہے۔ اِن دُعاؤں کی قبولیت کے ساتھ صبح کے وقت مانگی گئی مغفرت بھی ملتی ہے۔ جو شخص صبح کے وقت اپنی نیند قربان کر کے اللہ کے حضور کھڑا ہو کر معافی مانگے پھر کیسے ممکن ہے کہ اللہ اپنے بندے کی اِس ادا کو پسند نہ کرے۔ صبح کے وقت انسان اپنا آپ اور غرور و تکبر چھوڑ کر اللہ کی ذات کو پہچان سکتا ہے۔ بقول ادیب:

"صبح کا وقت جنت کے اوقات میں سے ایک ہے۔"

سوال نمبر 5 (صفحہ نمبر 1) (الف) [1] شاعر کا نام: شکیب جلالی

تشریح:

شکیب جلالی کا شمار اردو غزل کے ان شعراء میں ہوتا ہے جنھوں نے بھی عمر تو بہت کم پائی مگر ان کی شاعرانہ عظمت کبھی ختم نہ ہوئی۔ شکیب اپنے بارے میں لکھتے ہیں:

ع شکیب اپنے تعارف کے لیے یہ بات کافی ہے ہم اس راہ سے بچ کر چلتے ہیں جو عام ہو جائے

اِس شعر میں شاعر اپنی زندگی کے غموں کا اظہار کرتے ہیں کہ میں نے زندگی میں صرف دکھ ہی دیکھے ہیں۔ شاعر کہتے ہیں کہ میں نے گھر کے آنگن میں پیڑ لگایا اور اس کی نشوونما کی۔ لیکن جب پھل دینے کی باری آئی تو وہ پھل میرے گھر میں نہ گرے بلکہ ہمسایہ دیوار لوگوں کے پتھر مارنے سے جا لگے۔ شکیب دراصل کہتے ہیں کہ میں نے ساری زندگی لوگوں کے لیے وقف کر دی لیکن لوگوں کو آرام پہنچاتے ہوئے بھی مجھے کوئی راحت نہ ملی۔

ع اپنی تو وہ مثال ہے جیسے کوئی درخت
اوروں کو سایہ دے خود دھوپ میں رہ کر

شکیب نے یہاں یہ بیان نہیں کیا کہ اُنھیں کون سا غم تھا۔ غمِ دوراں نے بھی شکیب کو اپنی لپیٹ میں لے کر رکھا۔ اِس کے ساتھ ماں کی خودکشی اور دوسرے غموں نے ان کی ذہنی حالت کو بہت خراب کر رکھا تھا۔ شکیب کا محبوب ان کو چھوڑ کر رقیب کے پاس چلا گیا۔ یہ دکھ ان کے لیے بہت بڑا تھا کہ ساری زندگی انھوں نے محبوب سے محبت کی مگر ان کے محبوب نے ان سے بےوفائی کی۔

ع وہ مجھے چھوڑ کر جس شخص کے پاس گیا
برابری کا بھی ہوتا تو صبر آ جاتا

سوال نمبر 5 (صفحہ نمبر 2) [2]

تشریح:

شکیب جلالی کی شاعری میں قنوطیت کا عنصر غالب ہیں۔ انھوں نے غمِ دوراں اور غمِ جاناں سے تنگ آ کر بہت سی غزلیں لکھیں۔ ان کی وفات 32 سال ہی کی عمر میں ہو گئی تھی مگر ان کی شاعری آج تک زندہ ہے۔

؎ مجھ کو شاعر نہ کہو میرؔ کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کیے جمع تو دیوان کیا

تشریح طلب شعر میں شاعر کہتے ہیں کہ انسان کو اپنی عظمت برقرار رکھنی چاہیے۔ یہاں گرنا سے مراد شکست تسلیم کرنا اور ہار جانا ہے۔ شکیب کہتے ہیں کہ اگر میں نے شکست قبول ہی کرنی ہے تو میں خود سے اُسے قبول کر لوں گا جس طرح کوئی دیوار اپنے ہی سایے میں گرتی ہے اسی طرح میں بھی اپنے ہی قدموں میں گروں گا۔ کیونکہ یہ میری عظمت کے خلاف ہے کہ میں کسی سے بھیک مانگوں۔

؎ غیرت ہے بڑی چیز جہانِ تگ و دو میں
پہناتی ہے درویش کو تاجِ سرِ دارا

شکیب یہاں لوگوں کو خودداری اور غیرت کا درس دیتے ہیں کہ مشکل وقت میں کسی اور کے سامنے ہاتھ پھیلا نے سے انسان کی عظمت برقرار رہتی نہیں ہے اور وہ بے بس ہو جاتا ہے۔ اس کو مجازی معنوں میں لیا جائے تو شکیب کہتے ہیں کہ بے شک میں محبت میں مبتلا ہو چکا ہوں مگر میں محبوب کے آگے دستِ سوال دراز نہ کروں گا کیونکہ یہ میری عظمت کے خلاف ہے۔ میں اپنی ناکامی کو خود تسلیم کر لوں گا اور کسی کو نہ بتاؤں گا تاکہ میرا وقار برقرار رہے۔

؎ یہ کیا کافی نہیں کہ دونوں کا بھرم قائم رہے
اس نے بخشش نہیں کی میں نے گزارش نہیں کی

سوال نمبر 5 (صفحہ نمبر 3) [3]

تشریح:

شکیب جلالی کی ساری زندگی غموں کی تفسیر رہی۔ انھوں نے اپنی ماں کو ٹرین کے نیچے آکر خودکشی کرتے دیکھا۔ بعد میں غمِ دوراں اور غمِ جاناں نے ان کے دل کو اِس حد تک نڈھال کر دیا کہ ان کی شاعری میں قنوطیت کا عنصر غالب تھا۔ انھوں نے بالآخر ٹرین کے نیچے آکر خودکشی کرلی۔ بعد میں ان کی جیب سے یہ شعر نکالا:

؎ جو تو کہتا تھا کہ میں بوجھ ہوں کشتی پر — اب آنکھیں کو نہ ڈھانپ مجھے ڈوبتے بھی دیکھ

شاعر کہتے ہیں کہ ان کی ساری زندگی غموں میں اس طرح گزری ہے کہ اب انھیں روشنیاں متاثر نہیں کرتی۔ اب اگر انھیں کوئی خوشی مل بھی جائے تو بھی وہ غمزدہ ہی رہتے ہیں کہ اُن کی زندگی میں دکھ کے سوا اور کچھ نہیں۔ شاعر نے زندگی میں اتنے دکھ دیکھے ہیں کہ اب خوشیاں انھیں نہیں بھاتی۔

؎ نہ پوچھو عالم برگشتہ طالعی آتش
برستی آگ جو باراں کی آرزو کرتے

باہر کے موسم انسان کے دل پر اس وقت اثر کرتے ہیں جب انسان کے اندر کا موسم سہانا ہو۔ شاعر کو اب روشنی اور اندھیرے سے کوئی فرق نہیں پڑتا اور وہ کہتے ہیں کہ یہ جو ستارا میرے گھر میں گرا ہے یہ بےکار ہے کہ مجھے زندگی نے اِس حد تک دکھ دیے ہیں کہ اب چھوٹی خوشی میرے لیے کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہاں شاعر نے یہ نہیں بیان کیا کہ انھیں کیا غم تھا۔ یہ غمِ دوراں بھی ہو سکتا ہے اور غمِ جاناں بھی۔

؎ یہ فاصلہ تھا دعا اور مستجابی میں
کہ دھوپ مانگنے جاتے تو ابر آ جاتا

سوال نمبر 6 (صفحہ نمبر 1)

درخواست

بخدمت جناب صدر یونین کونسل علاقہ الف۔ب۔ج۔

عنوان: محلے میں آلودگی اور گندگی کا پھیلاؤ۔

جنابِ عالی!

نہایت ادب کے ساتھ گزارش ہے کہ میں آپ کے زیرِ صدارت علاقہ الف۔ب۔ج کا رہائشی ہوں۔ آج میں نے اپنے علاقے میں بڑھتی ہوئی آلودگی اور اُس سے پیدا ہونے والے مسائل سے تنگ آکر آپ کو یہ درخواست لکھی ہے کہ آپ اِس حوالے سے کوئی کام کریں۔

ہمارے علاقے میں جگہ جگہ کوڑا کرکٹ کا ڈھیر جمع ہے۔ محلّے میں گند کو پھینکنے کے لیے کوئی کچرے کے ڈبے موجود نہیں۔ جس کی وجہ سے محلّے کے لوگوں نے ایک پلاٹ میں کچرا پھینکنا شروع کر دیا تھا۔ اب وہ پلاٹ گندگی کے ڈھیر سے بھر چکا ہے اور لوگ اُس گندگی کی بدبو سے پریشان ہیں۔ گند کے ڈھیر کی بُو دور تک پھیل چکی ہے جس کی وجہ سے اہلِ علاقہ کا سانس لینا دُوبھر ہے۔ یہ منظر جہاں صرف آنکھوں کو بُرا لگتا ہے مگر اِس کے ساتھ اور بھی مسائل کا باعث ہے۔ گندگی کے اس ڈھیر پر مکھیوں اور مچھروں کی یلغار رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے بیماریاں پھیل رہی ہیں۔ علاقے میں ہیضہ اور ٹائیفائیڈ جیسی بیماریاں عام ہو چکی ہیں۔ بچے اور بزرگ اِس مرض میں بُری طرح مبتلا ہیں۔ کل ہی ایک بچے کی شدید ٹائیفائیڈ سے موت واقع ہوئی ہے۔ اِس کے علاوہ نالوں کا پانی جمع ہوتا ہے۔ گٹر اور نالیاں بُری طرح سے بند ہیں۔ جن کی وجہ سے گندا پانی سڑکوں پر جمع ہے۔ یہ گندا پانی لوگوں کے پاؤں میں آتا ہے مگر کسی کو اِسے صاف کرنے کا خیال نہیں۔ اِس پانی کی بُو سے اوسان خطا ہوتے ہیں۔ گٹروں کے ڈھکن غائب ہیں اور جو موجود ہیں وُہ ایسی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہیں کہ جن میں انسان گر سکتا ہے۔

سوال نمبر 6 (صفحہ نمبر 2)

کچھ عرصہ قبل علاقے کے ایک حصّے میں تعمیراتی کام ہوا۔ اُس کا سارا ملبہ ابھی تک وہیں پڑا ہے جو ہوا سے اُڑ کر روڈ پر آ چکا ہے اور ٹریفک کے نظام میں مشکلات کا باعث ہے۔ مگر علاقے کے حالات کو دیکھنے والا کوئی موجود نہیں ہے۔ آپ سے گزارش ہے کہ علاقے کا جائزہ لیا جائے اور مناسب جگہوں پر کوڑا ڈالنے کے لیے ڈبے لگائے جائیں۔ اِس کے ساتھ گندے نالوں کی صفائی کا کام کیا جائے اور گڑھوں کی مرمت کرنے کا آرڈر دیا جائے۔ محلے میں باقاعدگی سے خاکروب کی تائینانی کا حکم دیا جائے۔ تاکہ محلہ بہتر حال میں آسکے۔ اور بیماریوں سے پاک ہو سکے۔

آپ کی عین نوازش ہوگی۔

العارض

نیاز مند

ج، د، ہ۔

۱۵ مئی ۲۰۲۴ء

سوال نمبر 7 (صفحہ نمبر 1)

مضمون:

میرا پسندیدہ شاعر

؎ ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

یہ اللہ تعالیٰ کا قانون ہے کہ جب وہ کسی قوم پر رحمت نازل کرتا ہے تو اُس سے اچھے لوگوں کو بھیج دیتا ہے اور جب کسی قوم پر عذاب نازل کرتا ہے تو اُس سے اچھے لوگ اٹھا لیتا ہے۔ مغلوں کی کم ہمتی اور آپس کے جھگڑوں نے انگریزوں کو برصغیر کا حکمران بنا دیا۔ ایسے میں اللہ نے قابلیت اور نا اُمیدی کے پردے چاک کرکے اقبالؒ کو دنیا میں بھیجا۔

؎ اک ابرِ نوبہار فضاؤں پہ چھا گیا
اقبالؒ اِس چمن کی رگوں میں سما گیا

علامہ اقبال 9 نومبر 1877ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام شیخ نور محمد تھا اور آپ کے آباؤ اجداد کشمیری پنڈت تھے جنھوں نے بعد میں اسلام قبول کیا۔ اقبال نے ابتدائی تعلیم گھر سے حاصل کی اور مشن ہائی سکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور مرے کالج سیالکوٹ میں ایف۔ اے میں داخلہ لیا جہاں آپ کو خوش قسمتی سے شمس العلماء مولوی میر حسن کی صحبت ملی۔ ایف۔اے کے بعد آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ لیا۔ جہاں آپ کی ملاقات فاضل اُستاد پروفیسر آرنلڈ سے ہوئی اور یہی وُہ تعلق ہے جس نے اردو کو ایک مفکر شاعر عطا کیا۔

؎ تُو بات کا سچا، اخلاص کا پیکر
ہمت کا داعی اور جانباز دلاور

سوال نمبر 7 (صفحہ نمبر 2)

گورنمنٹ کالج سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد آپ کچھ عرصہ لاہور میں ملازمت کرتے رہے اور 1905ء میں اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان چلے گئے۔ جہاں پر کیمبرج یونیورسٹی سے آپ نے ایم۔اے کیا اور بعد میں جرمنی سے فلسفہ میں پی۔ایچ۔ڈی کی۔ 1908ء میں آپ وطن واپس تشریف لے آئے اور کچھ عرصہ درس و تدریس میں مشغول رہے۔ 1926ء میں آپ مجلس قانون ساز اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے۔ 1930ء میں آپ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے الٰہ آباد میں اپنا تاریخی خطاب دیا۔ جس میں انھوں نے دو قومی نظریے کو آگے بڑھایا اور مسلمانوں کے لیے الگ وطن کا مطالبہ کیا۔ اس بنا کر قوم نے آپ کو قومی شاعر اور شاعرِ مشرق کا لقب دیا۔ آپ نے بہت سی کتابیں لکھیں۔ جن میں بانگِ درا، بالِ جبریل، ضربِ کلیم، پیامِ مشرق، ارمغانِ حجاز شامل ہیں۔

؎ نگہ بلند، سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میرِ کارواں کے لیے

علامہ اقبالؒ نے اپنی شاعری کا آغاز غزل سے کیا۔ انھوں نے اردو اور فارسی میں غزلیں لکھی۔ اور شروع میں ہی دلوں کو چونکا دینے والے اشعار کہے۔

؎ تیرے عشق کی انتہا چاہتا ہوں
مری سادگی دیکھ میں کیا چاہتا ہوں

علامہ اقبالؒ نے اپنی شاعری میں مخصوص علامتیں پیش کیں۔ ملا، باز، شاہین، داغ، مومن اور ایسی دیگر بہت سی علامتوں کا استعمال کیا۔ اُنھوں نے عشق و عاشقی، سیاست، دین، وطنیت اور ملکیت پر اشعار لکھے۔

؎ جہانِ تازہ کی ہے افکارِ تازہ سے نمود
کہ سنگ و خشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

علامہ اقبالؒ نے مومن کا تصور پیش کیا۔ اُن کے نزدیک مومن وُہ کامل مسلمان ہے جو کائنات کے خشک و تر پر حکومت کرتا ہے۔ اُس کا بھروسا صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پہ ہے وہ کائنات کی اور کسی شے پہ بھروسا نہیں کرتا۔

؎ کافر ہے تو شمشیر پہ کرتا ہے بھروسا
مومن ہے تو بے تیغ بھی لڑتا ہے سپاہی

علامہ اقبالؒ نے عشقِ رسولؐ میں ڈوب کر بہت سی نظمیں لکھیں۔ اُن کے نزدیک ایک انسان صرف اُس وقت کی ترقی کر سکتا ہے جب وہ زندگی کو اللہ کے پیغام کے مطابق گزارے۔ صرف اسی صورت میں نہ صرف یہ دنیا بلکہ لوح و قلم بھی اس کی مرضی کے تابع ہو جائیں گے۔ بقول اقبالؒ:

؎ کی محمدؐ سے وفا تُو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

علامہ اقبال نے مسلمانوں کو مغربی قوموں کی کھوکھلی پیروی سے منع کیا۔ اُن کے مطابق مغرب کی سرپرستی سے مسلمان اپنا ایمان کھو بیٹھتے ہیں۔

؎ اپنی ملت پر قیاس اقوامِ مغرب سے نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قومِ رسولِ ہاشمیؐ
ان کی جمعیت کا ہے ملک و نسب پر انحصار
قوتِ مذہب سے مستحکم ہے جمعیت تری

سوال نمبر 7 (صفحہ نمبر 4)

علامہ اقبال نے مسلمانوں کو اتحاد و اتفاق کی تلقین کی۔ اُن کے مطابق مسلمان صرف اُس وقت تک ترقی کر سکتا ہے جب تک وہ دنیا کے ایک کونے سے لے کر دوسرے کونے تک متحد نہ ہو جائیں

ع ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کر تابخاکِ کاشغر

جواب شکوہ اور شکوہ ان کی شاہکار نظمیں ہیں۔ شکوہ 1911ء میں لکھی اور انھوں نے مسلمانوں کا اللہ سے شکوہ بیان کیا اور 1913ء میں اُس کا جواب لکھ کر مسلمانوں کو آگے بڑھنے اور کام کرنے کی تلقین کی۔

ع کوئی قابل ہو تو ہم شانِ کئی دیتے ہیں
ڈھونڈنے والے کو تو دنیا بھی نئی دیتے ہیں

علامہ اقبال نے بچوں کے لیے بھی بہت سی نظمیں لکھی۔ جن میں انھوں نے بچوں کو مختلف سبق دیے۔ اور زندگی گزارنے کا درس دیا۔ "ماں کی دعا" ایسی ہی ایک نظم ہے۔

ع لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمنا میری
زندگی شمع کی صورت ہو اجالا میری

تاریخ عالم کا یہ عظیم مفسر، مفکر اور شاعر 21 اپریل 1938ء کو ہم سے بچھڑا۔ اِن کی قبر بادشاہی مسجد کے احاطے میں واقع ہے۔ جہاں لوگ فاتحہ پڑھنے جاتے ہیں۔

ع جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے، اُدھر نکلے، اُدھر ڈوبے، اِدھر نکلے

ع سبق پڑھ پھر صداقت کا، عدالت کا، شجاعت کا
لیا جائے گا پھر تجھ سے کام دنیا کی امامت کا (اقبالؒ کا پیغام)